

اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

# قتدیلِ ادب

مدیر رانا عبدالرزاق خاں

[rana\\_razzaq@hotmail.com](mailto:rana_razzaq@hotmail.com)

فون نمبرز۔ 02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈیزائنر

عامر امیر۔ 07903126126

[majeedamer20@yahoo.com](mailto:majeedamer20@yahoo.com)

نگران ویب سائٹ، ایاز راٹھور

[www.bazmesherosukhan.co.uk](http://www.bazmesherosukhan.co.uk)



# سے کیا؟

دنیا نہ کرے پیار، کرے پیار، مجھے کیا؟  
 جب تم نہ رہے یار، مرے یار، مجھے کیا؟  
 اے تیر نظر آزما اس دل کی فراخی  
 اب تو رہے اس پار یا اس پار مجھے کیا؟  
 میں زندگی سے کھیل کے نکلا ہوں، پرہٹ!  
 اے موت! مجھے چھوڑ، مجھے مار، مجھے کیا؟  
 وہ جس نے کبھی اپنے قبیلے کو نہ پوچھا  
 اب آ گیا سردار سردار مجھے کیا؟  
 خود مجھ کو محبت کے عقیدے پہ لگا کر  
 اب رو رہے ہیں مجھ کو مرے یار، مجھے کیا؟  
 انعام میں جب وہ نہیں تو کھیل کیا کھیلے؟  
 اے دل! ہوتیری جیت، تری ہار، مجھے کیا؟

عامر امیر

آپ کے خطوط

ساجد رانا لندن سے رقم طراز ہیں۔ قتدیل ادب جنوری ۲۰۱۴ء بہت خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ کیا خوب آپ کی سلیکشن ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تعالیٰ آپ کی کاوشوں میں مزید برکت دے۔ دیارِ مغرب میں کیا ہی خوبصورت قتدیل ادب آپ نے روشن کی ہے۔

احمد فراز

گرفتہ دل عندلیب گھائل گلاب دیکھے  
محبوبوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے  
وہ دن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں  
یہ شہر اک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے  
یہ صبح کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے  
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے  
وہ ہشیم محروم کتنی محروم ہے کہ جس نے  
نہ خواب دیکھے نہ رت جگلوں کے عذاب دیکھے  
کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں  
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے  
عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی  
کہ میں نے دلہیز قاتلاں پر گلاب دیکھے  
یہ ساعت دید اور وحشت بڑھا گئی ہے  
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماہتاب دیکھے  
مجھے تو مکتبی کے دن یاد آگئے ہیں  
کہ میں اسے پڑھ رہا ہوں اور وہ کتاب دیکھے

عبید اللہ علیم

خواب ہی خواب کب تک دیکھوں  
کاش تجھ کو بھی اک جھلک دیکھوں  
چاندنی کا سماں تھا اور ہم تم  
اب ستارے پلک پلک دیکھوں  
جانے تو کس کا ہم سفر ہوگا  
میں تجھے اپنی جاں تک دیکھوں  
بند کیوں ذات میں رہوں اپنی  
موج بن جاؤں اور چھلک دیکھوں  
صبح میں دیر ہے تو پھر اک بار

شب کے زخار سے ڈھلک کر دیکھوں  
اُن کے قدموں تلے فلک اور میں  
صرف پہنائی فلک دیکھوں

محسن احسان

صوفی شہر مرے حق میں دعا کیا کرتا  
خود تھا محتاج عطا مجھ کو عطا کیا کرتا  
اپنی آواز کے سناٹے سے ہول آتا تھا  
میں بیابانِ تمنا سے صدا کیا کرتا  
سانس لیتے ہوئے سینے میں جلن ہوتی ہے  
میں ترے شہر کی شاداب فضا کیا کرتا  
مُستبِ جرمِ مرا دیکھ کے خاموش رہا  
خود خطا کا تھا، احکامِ سزا کیا کرتا  
اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں  
میں یہاں بُراتِ پرواز بھلا کیا کرتا  
میں لگا کر بھی متاعِ دل و دیدہ خوش ہوں  
نچھ سے رہبرِ گلہ مہر و وفا کیا کرتا  
رفعتِ دار بھی پھو لی تیری خاطر میں نے  
منکرِ عہدِ وفا! اور بتا کیا کرتا  
تم نے چھین لی مجھ سے مری گویائی بھی  
میں تو اک کاغذِ آتش زدہ تھا، کیا کرتا  
اب نہ وہ کشت ہی باقی ہے نہ وہ حاصلِ کشت  
اور اس دل کا زیاں سیلی بلا کیا کرتا  
خود فرموشی کے صحراؤں میں گم تھا محسن  
کوئی اس بے خبرِ جاں سے گلہ کیا کرتا

شہزاد احمد

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے  
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے  
آخِرِ کار ہوئے تیری رضا کے پابند  
ہم کہ ہر بات پر اصرار کیا کرتے تھے  
خاک ہیں اب تری گلیوں کے عزت والے  
جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے  
اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں

لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے شہر پر چھائی ہوئی سُرخ گھٹا ہے کب سے دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو چاند بھی میری طرح حُسن شناسا نکلا تم وہی ہو کہ مرے زخم سیا کرتے تھے اس کی دیوار پہ حیران کھڑا ہے کب سے ظلم کرتے ہو مگر اُف نہیں کرنے دیتے بات کرتا ہوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے تم سے اچھے کہ وہ تڑپنے تو دیا کرتے تھے کوئی انفاں کے پردے میں چھپا ہے کب سے ہم جو دستک کبھی دیتے تھے صبا کی مانند آپ دروازہ دل کھول دیا کرتے تھے حیرتِ چشم وہی شوخ قباہے کب سے اب تو شہزاد ستاروں پہ لگی ہیں نظریں کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجد کبھی ہم لوگ بھی مٹی سے جیا کرتے تھے ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت ، ہوا ہے کب سے

### ساغر صدیقی

### امجد مرزا امجد

ہے دُعا مگر حرفِ دُعا یاد نہیں میرا تو عشقِ موجبِ رسوائی ہو گیا میرے نعمات کو اندازِ نوا یاد نہیں میں آج خود ہی اپنا تماشا ہی ہو گیا ہم نے جن کی راہوں میں بچایا تھا لہو اُبھری جو تیری شکل تو یہ دل کا آئینہ ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں ٹوٹا کچھ اس طرح تیری انگڑائی ہو گیا زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے دیکھا تجھے عزیز رکھا اور کھو دیا جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں ٹھہرا جو وقت درد کی شہنائی ہو گیا میں نے پلکوں سے دریا پر دستک دی ہے تو آیا میں نہ تھا ، میں گیا تو نہیں ملا میں وہ سائل ہوں جیکوئی صدا یاد نہیں ایسے میں کون تھا کہ جو ہرجائی ہو گیا کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں ٹو اک گلی کے موڑ پہ گم ہو گیا تھا کل کیسے تھرائی ستاروں کی ضیا یاد نہیں امجد تو اس گلی کا ہی سودائی ہو گیا صرف دُھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے کب ہوا کون ہوا مجھ سے خفا یاد نہیں

### اقبال ساجد

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا لوگ کہتے ہیں ساغر کو خدا یاد نہیں چڑھتے سورج نے ہر ہاتھ میں شکول دیا

### امجد اسلام امجد

دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سواری نکلا لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے اے کڑی پُچ کے درو بامِ سجانے والے قرعہ فال مرے نام پہ گالی نکلا راس آئے مجھے مُرجھائے ہوئے زرد گلاب غم کا پَر تو مرے چہرے کی بجالی نکلا کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا رات جب گزری تو پھر صبح حنا رنگ ہوئی

آساں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی  
رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے دروبام  
چاند کی طرح مرا عکس خیالی  
تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ  
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی  
شہریار  
جب تو نہ پایا ہم نے  
اس بہانے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے  
سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے  
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے  
خود پشیمان ہوئے، نے اُسے شرمندہ  
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے  
عمر بھر سچ ہی کہا، سچ کے سوا کچھ نہ کہا  
اجر کیا اس کا ملے گا، یہ نہ سوچا ہم نے  
کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل  
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی  
بڑی آرزو تھی ملاقات کی  
شہ ہجر تک کو یہ تشویش ہے  
مسافر نے جانے کہاں رات کی  
مقدر مری چشم پر آب کا  
برستی ہوئی رات برسات کا  
اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں  
ندی گنگنائی خیالات کی  
میں چپ تھا ہوا رُک گئی  
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی  
کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں  
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کو ملنے سے روح جگمگانے لگے  
دل دھڑکنے لگے گنگنائے لگے  
چشم ویراں پھر جھلملانے لگے  
اپنے ہاتھوں سے خوشبو سی آنے لگے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کے لہجے میں لذت ہے ایمان کی  
جس کی باتوں میں خوشبو ہے آذان کی  
جس کا ہر پل ثناء رب رحمان کی  
جس کا ہر بول تفسیر قرآن کی

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جو کہے بس جیو تو خدا کے لئے  
ہر عمل ہو خدا کی رضا کے لئے  
سید الانبیاء مصطفیٰ ﷺ کے لئے

وقف ہو جائیں سارے دعا کے لئے  
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کا دستِ دعا اک اعجاز ہے

آدم چغتائی

اُجالے بھر دیئے تو نے گل تر کی قباؤں میں  
صبا کی مستیاں بھولے نہیں پتے خزاؤں میں

اس میلے میں پر دل نہ لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
اشعار کا فن لفظوں کا ہنر خود تو نے مجھ کو بخشا ہے  
اب کہتا ہے مت شعر سنا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
کم ظرف ہے پیہم فضلوں سے کچھ شوخی میں آجاتی ہے  
عربی کو زیادہ منہ نہ لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

### راجہ غالب احمد

کچھ دن ہم بھی اُداس رہے پھر صبح وہی پھر شام وہی  
چکر پھر اسی پیانے کا، پھر گردش میں ہے جام وہی  
دوست وہی، دشمن بھی وہی، شکوے بھی وہی الزام وہی  
اپنی دعائیں بھی ہیں وہی اور ہیں اُن کے دُشنام وہی  
میرے باغِ غم و آلام میں ایک سا موسم رہتا ہے  
زرد گلاب سے دن بھی وہی ہیں، راتیں بھی گلفام وہی  
” میرے رب مظلوم ہوں میں اب ظلم و ستم کو پیس بھی ڈال“  
نصرت تیری کب آئے گی ہو اس کا انجام وہی

### فرید احمد ناصر

تیرے جمال کا قصہ مرے خیال میں تھا  
سو لمحہ جو بھی تھا گزرا ترے وصال میں تھا  
مرا سوال تو آگے تھا اعتدال سے بھی  
ترا جواب مگر حدِ اعتدال میں تھا  
ہر اک لفظ میں پنہاں تھے معجزے تیرے  
نہ جانے تیرا قلم کس کے استعمال میں تھا  
ترے حروف تھے جادو، کمال تیرا کلام  
یہی کمال تو پنہاں ترے جمال میں تھا

### انور ندیم علوی

قرآن کو دیں گے عزت، جو دل سے اور جاں سے  
بے شک ملے گی عزت اُن کو بھی آسماں سے  
ہے اُس کی ایسی لذت، پائے گا اک سکینت  
پنی لے کبھی جو تشنہ اس چشمہ رواں سے  
اکمل بھی آخری بھی، عرفان کا سمندر  
ہر حرف ہے صداقت، دیکھے گا تو جہاں سے

### ابن کریم

صحرا میں پھول کھلائیں گے  
انہونی کر دکھلائیں گے  
جو جادو سب نے چھوڑ دیا  
ہم منزل تک لے جا نہیں گے

اب زمیں پہ جو خدا کی آواز ہے  
جس کا دھیما سا اپنا ہی انداز ہے  
جسکو ملنا سعادت ہے اعزاز ہے

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
جس کی نسبت سے ہم معتبر ہو گئے  
ہم سے پتھر بھی لعل و گہر ہو گئے  
بے ہنر، باہنر ہنر، باہنر ہو گئے  
کتنے اُجڑے ہوئے با شمر ہو گئے  
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں  
گو کہ عاشق ہزاروں کھڑے ہیں ادھر  
چشمِ تر ہم بھی جائیں گے اُس راگور  
ہم خطا کار ہیں جانتے ہیں مگر  
اُس کی پڑ جائے ہم پہ بھی شائد نظر  
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں

### ارشاد عرشى ملک۔۔۔ تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

یہ درد جو دل کو چیر گیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
میں عبد ترا تو میرا خدا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
اک تو ہی محم راز مرا، ہمدرد مرا دم ساز مرا  
بندوں سے مجھے آتی ہے حیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
کچھ دن جو قُرب میں گزرے ہیں وہ دن ہی مرا سرمایہ ہیں  
ہر دن میں تھا اک لطف نیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
میں تجھ سے باتیں کرتی ہوں ہنستی ہوں کبھی رو دیتی ہوں  
کیا تو نے مرا حال کیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
اب دنیا داری کی باتیں سنتے ہی نہیں ہیں کان مرے  
آہٹ پہ تری یہ دل اُٹکا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
میں چلتے پھرتے سوتے جاگتے تجھ سے باتیں کرتی ہوں  
تو کہتا ہے جا سر نہ کھا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
جس روز نہ تجھ سے مل پاؤں دل اکھڑا اکھڑا رہتا ہے  
وہ دن ہے گویا یومِ سزا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
ہر آن مرے ہمراہ بھی تُو پر پیارے بے پرداہ بھی تُو  
کھونے کا تجھے دھڑکا ہے لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں  
دنیا میں تُو نے بھیج دیا ہم آج بھی گئے اور رہ بھی لے





کس سے پوچھیں شہر میں ساجد پراتا سال اپنا ہمسفر گدا ہونے کو ہے  
روز ہوتے ہیں حادثے کتنے اور الوداع جام مانگے  
منور احمد کنڈے

ہر ایک نقش کو انوار کے حوالے کر  
پھر اپنی آنکھ کو دیوار کے حوالے کر  
نہیں ہے مالِ غنیمت کا مستحق کوئی  
جو کچھ ملا ہے وہ سردار کے حوالے کر  
دہکتی دھوپ نے فرمان کر دیا جاری  
اب اپنے سائے کو دیوار کے حوالے کر  
ملی ہے جس کی محبت نہ رکھ اُسے محروم  
جو یار کا ہے اُسے یار کے حوالے کر  
ادائے حُسن پہ گل کی نثار کر خوشبو  
کمالِ رنگ کو زُخار کے حوالے کر  
بتا رہا ہے زمانہ تجھے تری قیمت  
دلوں کا مال اب بازار کے حوالے کر  
برائیوں سے منور بچائے رکھ دامن  
ہوس کو درہم و دینار کے حوالے کر  
سوہن راہی۔۔۔۔۔ سال نومبارک ۲۰۱۴ء

(یہ نظم دوہوں میں ترتیب پائی ہے)

تھر تھراتی شمعیں تاروں کی اُداسی  
گھپ اندھیرے دل کے دامن  
روشنی کی پیاس آنکھوں کے دستچے  
ہو چکا یہ سب مرے احساس کے ننھے گھروندے میں  
دل کے آگن میں یہ کس کس کی دعا  
رنگ اور خوشبو اُڑائے  
کن کی آشائیں ہراول بیل بن کر  
سوچ کے ایوان پر بل کھا رہی ہیں  
کن دُعاؤں کے کبھی قرضے، تنناؤں کے تجھے،  
میرے آگن میں سمٹ کر، چاند تاروں کے اُجالے بن رہے ہیں  
یہ محبت اور دعا کا قرضِ کس طرح مجھ سے اُتارا جائے گا  
گھنیرے ڈکھ کے سائے جل رہے ہیں  
کنول چاہوں کے روشن ہو رہے ہیں  
میرے سانسوں میں آشا بہہ رہی ہے

### ارشادِ عرشِ ملک۔۔۔ دعا برائے لذت و حلاوت در نماز

اے خدا اندھا و ناکارہ و بد ذوق ہوں  
تیری اُلفت کی حلاوت سے نہیں ہوں آشنا  
ہاں مگر سنتا ہوں میں جب بھی ندا  
تو تجھے قدموں سے آتا ہوں ترے دربار میں  
بے دلی سے سر جھکاتا ہوں ترے دربار میں  
دل میں رہتا ہے خیالوں کا ہجوم  
گھیر لیتی ہے مجھے بادِ سوم  
بے حضوری سی ہے کیوں تیرے حضور  
کیوں نہیں ملتا مجھے لُطف و سرور  
عادتا یہ فرض کرتا ہوں ادا  
لذتِ گریہ سے ہوں نا آشنا  
اے خدا میری سعی پر کر نظر  
کر ہرا بے رنگ کوشش کا شجر

ہو	عطا	اس	پڑ	کو	کوئی	شمر
دل	پہ	اک	شعلہ	گرا	نور	کا
دیکھ	لوں	منظر	میں	کوہ	طور	کا
راکھ	ہوں	یہ	عرشی	سفلی	لذتیں	
قرب	کی	مجھ	کو	عطا	ہوں	برکتیں
واسطہ	ہے	مصطفیٰ	ﷺ	کے	نام	کا
تھام	لے	اب	ہاتھ	مجھ	ناکام	کا

## اُردو زبان کے ادوار اور فضیلت

رانا عبد الرزاق خاں لندن

جب ہم علم لسانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے میل جول سے ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ اور اختلاط کا یہ سلسلہ صدیوں تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہی نظریہ اس دور کی عالمگیر زبان اور لیگنوج افرانکا میں ثابت ہوتا ہے۔ کہاں سے یہ زبان چلی اور کہاں آ کر ٹھہری۔ یہ زمانے کی ضرورت بھی تھی۔ اور ایک عالمی حیثیت اختیار کر گئی۔ ہماری قومی زبان اردو نے بھی موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے بہت سے ادوار دیکھے۔ ایک خاص خطے میں بولی جانے والی یہ زبان جو اپنے ساتھ کئی زبانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے سفر پر نکلی۔ اردو زبان اس دور کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنے اندر فارسی عربی اور ہندی کو سموئے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں آریہ قوم ۱۵۰۰ء سو ق م پہلے آ کر آباد ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ قوم پھیلتی چلے گئی۔ اور اس کی زبان میں بھی فرق آتا گیا۔ اور آخراں کو ایک ایسی زبان کی ضرورت آن پڑی جو منظم اور نکسالی حیثیت رکھتی ہو۔ لہذا اس ضرورت کے لئے سنسکرت وجود میں آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بھی عروج ملا۔ اور مگر ساتھ ہی اسے دو اہم نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ الف۔ اس زمانہ میں اتنی ادبیت آگئی کہ عوام نے اسے استعمال کرنا ترک کر دیا۔ اس طرح یہ ایک خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ب۔ یہ کہ گوتم بدھ اور مہابیر سوامی والوں نے بھی اس زبان کی بجائے مقامی زبانوں میں مذہب کی ترویج و اشاعت کی۔ نتیجتاً عوام میں ان کی مقبولیت زیادہ ہو گئی۔ اب تو سنسکرت ایک خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ عوام نے ہمیشہ ایک مخلوط زبان رکھی۔ جو تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے طور پر رائج ہو گئیں۔ اور برابر چلتی رہیں۔ جن کو پراکرت کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ ان پراکرتوں میں سے ایک ادبی شکل پالی تھی۔ جس کا ذکر اشوک کی لاٹوں میں یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ مذہب اور انسان کا رشتہ ہمیشہ سے ہی بڑا قریب کا رہا ہے۔ مذہب نے زبانوں کی ترویج میں بہت کردار ادا کیا ہے۔ علماء و صوفیاء اور واعظین نے ہر زبان میں نئے الفاظ کا

اضافہ اور اس کا استعمال اس طرح کیا کہ آخروہ زبان کا ہی حصہ بن کر رہ گئے۔ انگریزی زبان کی بھی تاریخ میں بھی یہ بات نمایاں ہے کہ عیسائی مبلغین نے اس کی اشاعت اور ترویج کے لئے بہت کام کیا۔ اس زبان کے بولنے والوں پر سخت سے سخت حالات آئے مگر انہوں نے اسے زندہ رکھا۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ اس میں شامل ہوا۔ اردو زبان نے بھی یہ تدریجی دور خوب دیکھا۔ جن پراکرتوں ذکر اوپر آیا ہے ان کے متعلق یہ بھی یاد رہے۔ بعض ایسی پراکرتیں جو سنسکرت کی طرح ادبی حیثیت اختیار کر جاتیں۔ عوام انکو متروک کر کے پھر آپس میں ملی جلی زبان کو ایک خاص انداز سے پیش کر کے ایک نئی زبان اختیار کر لیتے۔ جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ اس میں سے ایک ذکر اب بھرنش کا ہے۔ اہل زبان نے اسے حقارت سے دیکھا اور اسی لئے اس زبان کو بھرنش کا نام دیا گیا یعنی بگڑی ہوئی زبان۔ اب بھرنش کے وجود کے بعد راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے زیر اثر گجرات، راجپوتانہ، اور دوآبہ کی بولیاں جب اس سے مل جل گئیں تو اس کو اتنا فروغ ملا کہ ۱۵۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک دوآبہ کی شور سینی اپ بھرنش تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی۔ جو موجودہ اُردو یا کھڑی بولی کا سبب بنی۔ پھر مغربی ہندی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے گرد و نواح کی اب بھرنش کا نتیجہ تھی۔ کا وجود ہوا جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رائج تھی۔ ۱۲۰۰ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے عربی و فارسی کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں تیزی سے بڑھتے گئے۔ امیر خسرو اور خواجہ سعد سلمان (وفات ۱۱۲۵ء) کی شاعری اس بات پر گواہی دیتی ہے۔ قطب الدین ایبک نے جب دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو یہاں لاہوری کی بجائے دہلوی زبان تھی۔ جو کئی زبانوں سے متاثر ہو کر اپنی ایک انفرادیت مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی۔ یہی وہ زبان تھی جس کی بنیاد پر اردو کا وجود قائم ہوا۔ جو زیادہ تر اب بھرنش کا اثر لئے ہوئے تھی۔ پنجاب سے مسلمان فارسی آمیز پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے مگر یہاں برج بھاشا کی نسبت کھڑی بولی اور ہریانی صوتیات اور صرف و نحو پنجابی سے ملتا جلتا پایا اور جلد اس کو سیکھ گئے۔ شاہ جہان کے دور میں آگرہ والوں کا اثر ہونے کی وجہ سے لب و لہجہ میں فرق آ گیا۔ اور بدل، لٹا، گڈی کی بجائے بادل، لونا، اور گاڑی کہنے لگے۔ فوجیوں نے بھی زبان دانی میں بڑا حصہ ڈالا۔ فوج میں اس وقت کڑی بولی کا اثر زیادہ رہا۔ کیونکہ وہ اقبال، کرنال، حصار، اور دہلی کے جنوب سے بھرتی ہوتے تھے۔ جہاں وہ جاتے تھے۔ یہ زبان لے جاتے۔ دہلی کی مرکزیت سارے ہندوستان پر چھا رہی تھی۔ اس لئے لوگ اس کی زبان کو بھی اہمیت دینے لگے اور جلد سیکھتے تھے۔ ان تمام ادوار سے گزرتی ہوئی یہ کھڑی بولی جو اردو زبان کی بنیاد بنی، ترقی کرتی رہی اور بابر کے ہندوستان آنے پر یہ ایک زبان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ زبان بابر اور ہمایوں کے دور میں آگے بڑھی۔ مگر اکبر کے دور میں اس کی ترقی کو نقصان ہوا۔ کیونکہ بعض وجوہ کی بنا پر اسکواگرہ کو

سرخ رنگ اور آہنگ ہے۔ یوں جو شے یا تجربہ نفس کی سطح پر ذاتی نہیں ہے وہ تخلیق کے مرحلے میں غیر یا موجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غیر ذاتی کو ذاتی بنانے کی امنگ شعراء کے ہاں اس آہنگ کو صورت بخشتی ہے۔ جسے حرف کہتے ہیں۔ پر یہ آہنگ شاعر کے نفس سے ایک خاص بودوباش چاہتا ہے یہ بودوباش دکھوں کے موسم ہیں۔ اس کے لئے موسموں کے لئے دکھوں کی فصلیں کاٹنی پڑتی ہیں یہ سلیقہ عبید اللہ علیم نے سیکھ لیا ہے۔ اسے دیکھ کر عرفی کا خیال آتا ہے عرفی کی شخصیت کو ہمیشہ مسحوریت کے ساتھ دیکھا گیا ہے اور صورت زخم سے ابا سننے کا سلیقہ سیکھنا پڑتا ہے۔۔ اُسے جوانی میں ہی زہر دے دیا گیا تھا۔ عبید اللہ علیم اُردو کا وہ عرفی ہے کہ زہر کھا کر بھی زندہ ہے ویسا ہی طرح دار، ویسا ہی طناد، ویسا ہی شفق نام، اور ویسا ہی انا پرست۔ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں وہ ایک اسلوب بھی ہے۔ لفظ اس کی وہ معنوت ہے جو ایک قرض دار سے سود خواہ قرض دار کی ہوتی ہے وہ الفاظ کا سود خوار ہے وہ لفظ سے ایک کے دو وصول کرتا ہے میرے خیال میں شاعری ایک ایسا معاملہ ہے کہ لفظ سے وہ سب کچھ وصول کرتا ہے جس سے اس کی جیب خالی ہو جاتی ہے۔ شعر اس کے ہاں ہنر نہیں ہے کہ ہنر ذات کے مساوی نہیں ہوتا۔ بلکہ شعر وہ چیز ہے جسے یونانیوں نے فضیلت سے تعبیر کیا ہے۔ اس فضیلت نے نغسگی کا لباس پہنا ہوا ہے۔ نغسگی جو اس کے اشعار کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ عبید اللہ علیم کی تمام غزلوں میں گائے جانے کی جو بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے وہ اس کے ہم عصر شعراء کی غزلوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا یہ شعر تھا کہ جمال کی انفرادیت پسند روح کا نغمہ ہے جو ذات اور کائنات میں آواز کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ میں نے ہیجان ذات کے لئے ایک خاص سیاق کے کلام میں ابھی عشق کا لفظ استعمال کیا تھا۔ عبید اللہ علیم اپنی بنیاد اور نہاد میں عشق غیر مشروط اور غیر مدلل عشق کا آدی ہے۔ اس کے نزدیک عشق اپنی دلیل آپ ہے اس نے مجھے تعلیم دی کہ عشق اختیار کرو اسے سیکھو غرض عبید اللہ علیم میرا معلم عشق بھی تھا۔

**تاریخ سکھاتی ہے صرف اُن کو جو سیکھنا چاہیں..... فراز حمید خاں**

ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا اس سے پہلی رات بھی فرقہ پرست مسلمان مناظروں اور مباحثوں میں مصروف تھے۔ اور ایک دوسرے کو کافر کہنے میں مصروف تھے۔ صبح جب منگول بغداد میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ شیعہ دیکھا نہ سُنی، نہ اہل حدیث، نہ خفی نہ مالکی۔ ان کو جو بھی مسلمان ملا اسے بلا تفریق اور بے دریغ قتل کر دیا۔

**ابلیس..... اعزاز لطیف خان**

خدا نخواستہ کل شام تم تمام پاکستانی یہ الزام بھی میرے سر تھوپ دو کہ ہم تو بس شیطان کے بہلاوے میں آگئے تھے۔ حالانکہ یہ سب کچھ تم اپنی مرضی سے کرو گے۔ لیکن ہوگا میری مرضی کے عین مطابق، مگر خبردار کسی کو بتانا مت، بس تم نامعلوم ہو اور نامعلوم ہی کو ووٹ دینا کیونکہ کل جب تم مجھ سے جو کام بھی لو گے میں بھی نامعلوم ہی لوگوں سے تمہارے یہ کام کروا کر دوں گا۔ اور سب کچھ ہماری مرضی سے ہی ہوگا۔ ہاں مگر یاد رکھنا

آگے رکھنا پڑا۔ مگر نے جب شاہ جہان نے آگرہ چھوڑا تو دہلی آباد کیا تو دہلی زبان کو عروج ملا تب یہ شاہ جہانی اردو بن گئی۔ اور نگزیب کے زمانے میں اسے سب سے زیادہ اہمیت ملی۔ اور اس کا نام اردوئے شاہی ہونے لگا۔ اب مسلمان شعراء مثلاً عبدالرحیم خان خاناں نے برج بھاشا کو ترک کر کے اسی اردوئے شاہی کو اپنانا شروع کر دیا۔ یوں شمالی ہند میں اردو کا بیج بویا گیا۔ اور جب محمد تعلق نے دیو گرنی شہر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور ہر شخص کو دہلی سے دکن جا کر آباد ہونے کا حکم دیا تو مال و اسباب کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں ساتھ گئی۔ کئی لوگوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ جلد ہی قبول کر لیا۔ اور یوں کئی اردو کا باب کھل گیا۔ اس زبان میں تحریریں بھی ملنے لگیں۔ ہر خاص و عام ولی و صوفی نے اس زبان سے کام لینا شروع کر دیا اور خدا نے بھی اسے اپنے فضل سے یوں بخشا کہ اب اس کا ڈنکا تمام جہانوں میں گونجنے لگا ہے۔ اور اہل اردو بواجب دہل یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ

**سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے (ماخوذ )**

**جون ایلیا عبید اللہ علیم کے ہم عصر بھی تھے اور ہم عمر بھی۔ وہ عبید اللہ علیم کی شاعری سے متعلق فرماتے ہیں۔**

عبید اللہ علیم ایک سکھ بند شاعر تھے۔ شاعری میں عبید اللہ علیم کا درود ایک فتنے کا ظہور تھا اس کی ذات ایک ماجرا خیز اور پیکار طلب ذات ہے مگر میں اس کی شاعری کا سرچشمہ ہیجان ذات ہے جیسے کائنات کا سرچشمہ ہیجان وجود ہے۔ ہیجان ذات اپنے اندر سمٹنے کا نہیں پھیلنے کا انداز ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہیجان ذات کے لئے تخلیق اصل ایک اور لفظ ماجرا ناک لفظ یعنی عشق استعمال کروں۔ مگر ہیجان ذات سے جو شاعری صورت پذیر ہوئی ہے وہ ہیجانی نہیں ہے۔ ہیجان دراصل اس کی شاعری کے وجود کی قوت ہے صورت اور معنویت نہیں۔ اس کی شاعری صورت میں رنگ ہے اور معنی میں تلاش رنگ۔ یہ تلاش رنگ وصال میں فراق اور فراق میں وصال کا سفر ہے وہ شاعری نہیں بلکہ شاعر کے اندر کا وہ شاعر بھی ہے جسے شعور کی سب سے بدنام اور سرگرم سچائی کا استعارہ کہا جائے۔ اس کی شاعری شاعری کے علاوہ وہ الوہی شیطنت بھی ہے۔ جو بطون ذات سے ماوراء کی طرف ہجوم کرتی ہے اور ایک نئے خیال اور ایک نئے جمال کو اپنی گرفت میں لے کر بطون ذات کی طرف پلٹ آتی ہے۔ اس نے ایک نکتہ دریافت کیا ہے وہ یہ ہے کہ ادب دعویٰ کرتا ہے۔ دلائل پیش نہیں کرتا کہ ادب تخلیق ہے اور تخلیق خدا۔ اور اسرائیلیوں کے خداوند (یا وہ) نے اپنے لئے جو کہا ہے کہ ”وہ جو ہے سو وہ ہے“ علیم نے بھی اپنے لئے کہا ہے ”جیسا بھی ہوں میں اپنی صورت پر ہوں علیم“ جیسا بھی ہوں علیم اس سے کہیں بڑی ایک جواب دہی چاہتا ہے۔ انہوہ میں جان لیوا تہائی ہے۔ یہ ماورائے ذات کو اپنے طور میں اپنے نفس میں خلق کرنا ہے۔ اس کا عشق غیر ذات کو نفس ذات کو دیکھنے کی زخم خوردہ اُمنگ ہے۔ اور اس کی شاعری اس اُمنگ کا



ہندوستان اور انگلستان کیا کہ تمام جہان کو ہمیشہ کیلئے ماتم کدہ بنا گئیں۔ سچ ہے:

کیا اعتبار دہر کا عبرت کا جا ہے یہ: عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

اگر ہم لوگ دبائے طاعون میں گھر کر بے خانماں کبھی بے پدر، کبھی بے درماں ہوتے تو آپ ہمارے لئے کلیجہ پکڑے دل موسے پھرتی تھیں۔ اور جو ہمارے اوپر بلائے قحط نازل ہوتی تو آپ اس خیال سے کہ بھوکوں کی سار بھوکا ہی جانتا ہے کھانا چھوڑ دیتی تھیں۔ دار جیلنگ میں زلزلہ آیا آپ کا دل درد مند انگلستان میں تھا ہمدردی کیلئے تار باندھ دیا کہ روتوں بلکتوں کو دین دنیا کا سہارا مل گیا۔ اگر شمالی سرحد پر لڑائی ہوتی یا ٹرانسوال پر یا چین پر چڑھائی ہوتی اور احياناً وہاں ذرا سی آپ کی جاٹا رسپاہ کی انگلی کٹتی تو یہاں بیکل ہو کر آپ کا دل کٹتا۔ تیبیوں سے مل کر آپ روتیں۔ کیونکہ خود بھی چھوٹی سی عمر میں یتیم بلکہ در یتیم ہو گئی تھیں۔

بیواؤں کیساتھ آپ سر جوڑتیں، کس لئے کہ عالم شباب میں خود بھی بیوہ ہو چکی تھیں۔ ادھر امیروں کی پناہ یافتہ ہزاری باپ بنی ہوئی تھیں تو ادھر غریبوں کی درد مند پسنداری ماں سے کم نہ تھیں۔ بیواؤں کی وارث تھیں۔ مفلسوں کی ضرورتوں کا ذخیرہ، گو آپ کا بڑا مرتبہ اور اعلیٰ پایہ کا تھا مگر رعایا پر یکساں اور برابر ایک ابر رحمت کا سایہ تھا۔ محروسہ ریاستوں اور مقبوضہ ممالک کے دلوں پر آپ کا قبضہ تھا۔ مسکینوں کو جاڑے میں جڑا دل، محتاجوں کو گرمی میں مندرس آپ کے توشہ خانہ سے ملتی تھی۔ اپنی دستکاری ہی سے آپ ان لوگوں کی مدد فرماتی تھیں جنہیں کچھ میسر نہ ہوتا تھا۔ بھوکوں کی بھوک پیاسوں کی پیاس، آپ کی زیارت سے بھرتی اور بچتی تھی۔ یہ آپ ہی کے اخلاق حسنہ کا سکہ تھا جس نے ہندوستانیوں کے دلوں کو موم بنا کر ان کے منہ پر شکوہ و شکایت کی روشن مہر لگادی تھی۔ آپ جس طرح رحمدلی اور خدا ترسی کی پوٹ تھیں اسی طرح سخاوت اور عدالت بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ باوجودیکہ آپ کے اور ہمارے مذہب میں کوسوں کا بل تھا مگر نہیں سب نے آپ کے اور آپ سب مذہبوں کی حامی و مددگار تھیں۔ ہر فرقہ آپ کو اپنا سرتاج، اور آپ کے راج کو دیوی دیوتا کا راج سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے واسطے آپ زبیدہ خاتون اور ہندوؤں کیلئے امن وامان کی قابل پرستش دیوی تھیں۔ اب ایسی رانی مہارانی کہاں جو من مانی مرادیں بر لائے۔ رعیت کے ہر ایک دکھ میں دوڑ کر شریک ہو جائے۔ خدا تعالیٰ نے علوم ادبیہ کا آپ کو معمول بنایا اور یہاں تک سدھایا تھا کہ جس وقت آپ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئیں اور آپ کے چھوٹ چچا جان نے دوزانو جھک کر حسب دستور شاہی آداب بجالایا اور عام رعیت کی طرح فرمانبرداری کا سر جھکایا تو آپ کا ایسا دل بھرا آیا کہ آپ اسی وقت زار و قطار رو پڑیں۔ اور بیتا بن فرمایا کہ اچھے چچا میرے آگے اس طرح کیوں جھکتے ہو؟ میں تو تمہاری گودیوں کی کھلائی ہوئی وکٹوریہ جھتی ہوں۔ علوم ادبیہ پر ہی کیا موقوف ہے جرمنی، فرانسیسی، لاطینی اور اب اخیر وقت میں ہندوستانی زبان آپ کی مادری زبان بن گئی تھی۔ ستر برس کی عمر میں اس طرف توجہ فرمائی اور گیارہ برس تک ہندوستانی رو و ساداران

انگلستان سے بات چیت کرنے میں ان کی عزت افزائی فرماتی رہیں۔

۲۴ مئی ۱۸۱۹ء کی وہ شہ گھڑی سب کو یاد ہوگی جس میں جنم لینے کے شادیاں کی دھوم مچ رہی تھی۔ شاہی محلوں میں بدھائیوں اور مبارکبادیوں کی گہما گہمی ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۰ء کی دو طرفہ امنگ اور رچاؤ سے بھری ہوئی ساعت کو بھی کوئی بھولا نہ ہوگا جبکہ آپ خراماں خراماں شاداں و فرحاں بھولی بھولی دلہن بن کر گر جائیں گئی ہوں گی۔ ساتھ ہی وہ زمانہ بھی یاد آ گیا جس وقت کہ آپ نے ۱۸۶۱ء میں رٹنڈ سالہ پہننا تھا جس کا غم اخیر دم تی ہمدم رہا۔ ۱۸۷۷ء کے قیصری خطاب کی عالمگیر خوشی بھی ابھی تک دلوں سے دور نہ ہوئی ہو گی۔ ریپلی سنہری ڈائمنڈ جو بلی بھی دلوں سے محو نہ ہوئی ہوگی کہ دفعہ ۱۹، ۲۰، اور ۱۳ جنوری ۱۹۰۱ء کو وہ چمکتا ہوا چودھویں رات کا چاند ماند پڑا۔ اور ۲۲ کوسب سے بلند آسمان پر چڑھ گیا۔ آج ۲ فروری کو اس کے ہمیشہ کے واسطے غروب ہو جانے کا دن ہے جس کے سبب تمام ہندوستان اور انگلستان وغیرہ میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ ماتم کی کھٹا، غم کا بادل چاروں طرف امنڈ امنڈ کر چلا آتا ہے اور ادھر سے ادھر تک آنسوؤں کی جھری لگا تا چلا جاتا ہے۔

اے آپ کی سیرت و صورت کے بھوکو، آؤ اس ماہ کامل کے اخیر دیدار کو دیکھ لو۔ پھر یہ مؤمنی صورت کہاں۔ اب اسکی بجائے تمہارا دل داغ جدائی کی منزل ہوگا۔ اگر تم پاتال میں جا کر بھی ڈھونڈو گے تو اس ڈوبے ہوئے چاند کا پتہ نہ پاؤ گے۔ اسی طرح روتے پٹیتے سر پر خاک ڈال کر چلے آؤ گے۔ اے وکٹوریہ کو گودیوں میں کھلانے والو اے اسکی آغوش محبت میں پلٹنے والو آج تم کس دل سے نرم نرم اور گرم بستر سے اٹھا کر ٹھنڈی ٹھنڈی زمین اور خاکستر میں سلاتے ہو؟ کیا تمہارا دل ایسے رحمدل کے واسطے نہیں کڑھتا۔ ہائے کیا کرو مجبور ہو معذور ہو بقول شخصے: کیا اس ترے بیمار کو امید شفا ہو۔ جس کو کہ اثر ہو نہ دعا کا نہ دوا کا۔ افسوس صد افسوس واہ اس صورت کدے میں دیکھتے ہی دیکھتے صورتیں کیا کیا نظر سے اپنی پنہاں ہو گئیں۔ ہائے آج انگلستانی زمینداروں کے جھونپڑوں میں جا جا کر خبر گیری کرنے والا ان کے گھر کا اجالا چاند کہاں چھپ گیا۔ غریب مریضوں کو تفتی دے دیکر اچھا کرنے والا مسیحا کدھر چلا گیا۔ دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھلونے لادینے اور ان کا مان رکھنے والا باپ کہاں جا سوا۔ اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا اکامتا جوں پر جاں نثار کر دینے والا حاتم صفت تھی کس نیند سوراہا ہے کہ جائے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جس کی مدح سرائی میں ۶۳ برس سے زبان مقال لال تھی۔ اس کا مرثیہ کیوں نہ باعث ملال و اضمحلال ہو۔ وہ امور خانہ داری کی ملکہ، وہ ذاتی صفات شعاری کی قیصرہ۔ وہ خوش معاملگی کی دیوی۔ وہ دیا اور دھرم کی رانی، وہ عصمت و عفت کی شہزادی وہ صبر و تحمل کی دل دادہ۔ وہ نیک نیت نیک طینت، صاحب اقبال صا حب کمال۔ خداوند کنکٹ خداوند جاہ۔ عزیزے برائیا شفیق سپاہ۔ سیناستی پتی برتاسلطانہ۔ وہ وفاداری کی جان ہائے آج کیوں بے نام و نشان ہوتی ہے۔ جس کی حکومت کا سورج کبھی نہیں چھپتا۔ آج وہ ہماری نظروں سے چھپی جاتی ہے۔ نہیں نہیں وہ اپنے خاندان حقیقی

زبان کے بارہ میں تحقیقات کا سلسلہ بڑھتا گیا اس خیال کو بھی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن سے نہ صرف اس زبان کے مقام میں تبدیلی آگئی بلکہ عہد اور زمانے میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ اس سے پہلے عام یہی خیال تھا کہ اردو اپنی متکلم شکل میں سلاطین مغلیہ کے لشکروں میں پیدا ہوئی۔ اور وہیں پرورش پا کر ادھر ادھر پھیل گئی۔ انہی سرپرستیوں اور ادب نوازیوں کی بدولت دہلی اردو زبان کا مرکز بنی اور قلعہ معلیٰ کی پاکیزہ اور شستہ زبان اردوئے معلیٰ کہلائی۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ دکن کا نظریہ موجود تھا۔ اور اہل دکن اس بات کے دعوے دار تھے کہ اردو کا مولد و منشاء سرزمین دکن ہے۔ یہ خیال اس حد تک تو ضرور صحیح تھا کہ اردو کی سب سے پہلی تصنیف دکن میں ہی سے ہوئی۔ لیکن اس امر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ زبان کے لئے تفصیلی صلاحیت پیدا کرنے سے پہلے اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ امر ابھی تک پایہ تحقیق کو نہیں پہنچا تھا۔ کئی نظریے کے متعلق زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ بعض تاریخی واقعات اور خارجی و اندرونی شہادتیں اس کے خلاف موجود تھیں۔ لیکن ان تاریخی شواہد کی چھان بین پورے طور پر نہیں ہوئی تھی۔ اور اردو زبان کے ابتدائی نمونے ابھی پردہ انہاء میں تھے۔ مزید برآں اس نظریہ کے علمبردار خود اس بات کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ گو یہ اعتراف دہلی زبان میں تھا۔ شمس اللہ قادری نے ”اردوئے قدیم“ میں دکنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ زبان شمال سے حملہ آوروں کے ساتھ دکن میں آئی پھر ایک اور جگہ تفصیل سے چٹھے چٹھے یوں کہا کہ: ”مصنفین نے عدم واقفیت کے باعث اردو کی اس سرگذشت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو دکن سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ان کی تصریحات نہایت ناقص اور متضاد ہو گئیں ہیں۔ تاریخ اردو کا یہ تاریک حصہ جو کئی سالوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر روشنی میں لایا جائے اور اس کی زبان پر اردو زبان کی عہد بجد ترقیات مطالعہ کی جائیں۔ اور اس کے بعد اس کی تاریخ کو سلسلہ وار ترتیب دیا جائے تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ آل سبکگین کے زمانے میں اردو زبان کی ابتدا ہوئی۔“ بعد میں آنے والوں نے تو کھلے طور پر تسلیم کر لیا کہ اردو کی داغ بیل سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں پڑی دکن میں اردو کا مصنف کہتا ہے ”گلستان ہند کے شمال چمن میں مغربی دروازے کے باغبانوں نے آکر اردو کا بیج بویا۔ گنگا جمن نے آبیاری کر کے چھوٹے سے پودے کو اگایا اسی کے قریب گلزار دکن میں انہی ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔“ ”اردو شہ پارے“ کا مولف مسعود سعد سلیمان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”مسعود نے تین دیوان مرتب کئے تھے ان میں سے ایک ہندی میں تھا۔ امیر خسرو نے اپنے دیوان غزوة الکمال کے دیباچہ میں مسعود کے دیوان کے متعلق یہی لکھا ہے۔ مسعود لاہور کا باشندہ تھا جس وقت مسلمانوں نے دہلی فتح کی وہ بقیہ حیات تھا۔ اسی طرح اس نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا وہ یقیناً اسی زبان کا تھا۔ جو پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ اور وہ زبان بہت ممکن ہے کہ اردو کی بالکل ابتدائی صورت ہو۔“ ”اردو شہ پارے“ کے مولف ڈاکٹر سید محمد محی الدین قادری کا یہ بیان فی الحقیقت

کی دلہن بن کر سدھارتی اور ہم سب کو اپنی محبت میں تڑپتا ہوا چھوڑے جاتی ہے۔ ماں کا گزرنا جو کچھ مصیبت لاتا ہے اسے کون نہیں جانتا کہ کیا کیا دکھ دکھاتا اور کیا کیا کیسا ستاتا ہے۔ ہائے ہماری مادر مہربان ملکہ انگلستان آپ آج ایسی سکھ نیند سوئی ہیں کہ اپنے پیارے دلارے بچوں کے جگانے سے بھی نہیں اٹھتیں مشہور تو یہ ہے: جہاں میں جن کو حکومت ہے ان کو نیند کہاں: کہ لگنے دیتی نہیں فکر و بندوبست کی آنکھ۔ مگر آپ کی وہ فکر وہ ہمدردی وہ دردمندی و دلسوزی کہاں ہے کہ ہم بلکتے ہیں اور آپ پرواہ نہیں کرتیں۔ دیکھو تو آپ کے لاڈ لے ایڈورڈ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہے ہیں اور کھڑی پچھاڑیں کھا رہے ہیں۔ سنو تو آپ کے سب بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں نو اسے نو اسیاں کنوا سے کنوا سیاں کن حسرت بھری نگاہوں سے مایوسانہ و مجبورانہ آپ کے چہرہ مبارک تو تک رہی ہیں۔ آج ہماری مانتا اور ہمارا خیال کہاں گیا۔ اچھی کیا محبت کا بالکل وصال ہو گیا۔ ادھر آپ خاموش ہیں ادھر ہم سب سکتے کے عالم میں مدہوش۔ تن کی خبر ہے نہ بدن کا ہوش۔ جو سر ہے وبال دوش ہو رہا ہے۔ جو نظارہ ہے ہوش کھور ہا ہے۔ ایک طرف آپکا انڈین سکیرٹری زار زار ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ دوسری طرف اس کی پاکدامن بیوی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ مگر آپ ایک کی بھی نہیں سنتیں۔ ادھر یہ آپ کے ہندوستانی دونوں خدمتگار حکم سلطانی کا انتظار کر رہے ہیں۔

ادھر آپ کا یہ مرثیہ نگار جس کے ایڈریس اور تصنیف کی رسید میں آپ نے زبان فیض بیان سے یہ قابل فخر فقرے لکھوائے تھے کہ: ما بدولت تمہارے ایڈریس، تمہاری کتابوں، تمہاری اطاعت قلبی، اور اظہار وفاداری کی قدر فرماتی ہیں۔ دھاروں رو رہا ہے اور اسی عالم میں یہ چند سطور اور تاریخ وفات لکھ کر دل کا بخار نکال رہا ہے۔ رہے جہاں میں نہ باقی سفید ایک ورق: جو میرا قصہ غم ہو کتاب میں داخل۔ الملتمس ماتم زدہ و پریشاں سید احمد دہلوی مؤلف ہندوستانی ڈکشنری معروف بہ فرہنگ آصفیہ وغیرہ، از دہلی حویلی مظفر خاں، ۲۰ فروری ۱۹۰۱ء، شنبہ یوم دفن حضور قیصرہ۔

○○○○○

اردو زبان کی ابتدا صوفی غلام مصطفی تبسم کی نظر میں

رانا عبد الرزاق خاں

آج تک اردو زبان کی ابتدا کے متعلق بہت سے نظریے قائم کئے جا چکے ہیں سب سے پرانا اور مشہور ترین خیال اردو کی ولادت کے متعلق وہ ہے جو محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ”آب حیات“ میں پیش کیا ہے۔ کہ یہ زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ جو دہلی اور دوآبہ کے گرد و نواح کی زبان تھی۔ اور اس میں سب سے پہلے لکھنے والے امیر خسرو تھے۔ جن کی کتاب ”خالق باری“ اردو فارسی لغت ہے۔ یہ خیال دراصل یورپ کے بعض فاضلوں مثلاً گارسان، و اتاسی اور ڈاکٹر سپرنگر کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس میں مولانا صہبائی اور دوسرے اردو کے ابتدائی تذکرہ نگار بھی شامل ہیں۔ لیکن جوں جوں اس

زبان وجود میں آئی۔ جوان کے معاشرتی، تجارتی ضروریات کے لئے کافی تھی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جوں جوں مسلمان حملہ آوروں اور نوواردوں کے قدم پنجاب کی سرزمین سے آگے بڑھتے چلے گئے تو زبان بھی پھیلتی چلی گئی۔ پنجاب سے دہلی اور دہلی سے شمالی ہندوستان کے باقی علاقوں میں پہنچی۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے وہ برج بھاشا اور اردو باہمی ربط و ضبط ہے کہ یہ کہنا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور اسی کی ایک شاخ ہے اس نظریہ کی تردید ذرا حافظ محمود شیرانی کے الفاظ میں سنیے:۔ ”جب ہم اردو کے ڈول اس کی وضاحت کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے۔ برج بھاشا کا ڈھنگ اور ہے دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریب رکھتی ہے۔ برج بھاشا سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لے لینا دوسری بات ہے لیکن جہاں برج بھاشا نے اس سے الفظ مستعار لئے ہیں وہاں پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے اور برج بھاشا پر کیا موقوف ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو سے پر تو سے خالی نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ اردو زبان بین الاقوامی ضروریات کے لئے وجود میں آئی۔ لیکن بہت جلد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی اس نے سٹیج پار ہو کر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی اہل عملہ دست کار، پیشہ ور، مزدور، فقیر درویشوں مسافر کا ساتھ دیا۔ دکن و بنگال و گجرات جہاں کہیں وہ گئے یہ ان کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بسی۔ ابتدا میں یہ غیر تعلیم یافتہ عوامی طبقے کی زبان تھی آخر اس کی ہر دلچسپی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اس پر توجہ دی۔ مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد سب سے موثر حملہ جو دکن پر ہوا وہ سلطان علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں اسکے بیٹے خضر خاں نے کیا گیا یہ سمجھنا چاہیے کہ اس زمانے سے اردو کی داغ بیل دکن میں پڑ گئی اس کے تقریباً پون صدی بعد سلطان محمد تغلق نے دلی سے اپنا دارالسلطنت منتقل کرتے ہوئے دولت آباد میں اپنی راجدہانی قائم کر لی۔ دہلی کی بیشتر آبادی کو نئے دارالسلطنت میں بسنے کے شدید احکام جاری ہوئے اسی زبردست خلط ملط کے طفیل اردو دکن کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئی۔ اسی زمانے میں اس میں بول چال شروع ہوئی۔ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں دکن کی سرزمین اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ ا۔ ایک تو یہ کہ دکن کے فرمانرواؤں کی محل سراؤں میں ہندو رانیاں داخل ہو گئیں۔ جس سے ان کے تعلقات وہاں کے ہندو باشندوں سے زیادہ استوار ہو گئے۔ لازمی امر تھا کہ وہ ایسی زبان کو جو نہ تو اجنبی ہو اور نہ ہندوستان کی قدیم پراکرت، نسبتاً زیادہ پسند کرتے جو دو قوموں کے میل ملاپ کا ذریعہ تھی۔ اور جس کا اختیار کرنا دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتا تھا۔ ۲۔ دوسری وجہ اس سرزمین میں صوفیاء اور مشائخ کی کثرت تھی۔ جن کا کام اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تبلیغ و اشاعت کے لئے عوام سے رابطہ و اتحاد قائم کرنا پڑتا ہوگا۔ لازماً ایک ایسی زبان کو ذریعہ

حافظ محمود شیرانی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ کے رد عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اردو کی ابتدا کا مسئلہ ہمیشہ بحث طلب رہا۔ دلی لکھنؤ، پنجاب و دکن ہمیشہ اس بارے میں اُلجھتے رہے۔ یہاں تک کہ حافظ محمود شیرانی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ شائع ہوئی۔ اور اسے بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ تمام امور پر روشنی ڈالی۔ جو زبان کے مولد و منشا کے متعلق برسوں سے تنازعہ فیہ رہے تھے۔ ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاسی اور معاشرتی ماحول اور زبان کی ساخت اور اس کے صرفی و نحوی قاعدے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ موجودہ اردو زبان کو پنجاب کی زبان سے ایک گونہ مماثلت ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے پر ”دکن سکول“ اور ”برج بھاشا سکول“ کے پرستاروں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن جب لوگوں نے تاریخی شواہد کو ٹٹولا اور ان کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا تو رفتہ رفتہ طبائع کا میلان اس خیال کی طرف ہوتا گیا بالآخر اس نظریہ کی تائید کی۔ اس نظریے کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد، ان کی عسکری کارگزاریوں، اور فتوحات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگرچہ ابتداء میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا اور اپنے مختصر زمانہ حکومت میں اس ملک کی اقوام سے انتظامی میل جول پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ اس سے پیشتر بھی مسلمانوں، اور پنجابیوں اور سندھیوں میں تمدنی میل جول شروع ہو چکا تھا۔ تاہم سب سے بڑا سیاسی انقلاب محمود غزنوی کے حملوں نے کیا۔ جس کے معروف سترہ حملوں نے نسل انسانی کے دو مختلف گروہوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ بقول مورخ فرشتہ ”غزنی گویا ہندوستان کا ایک صوبہ معلوم ہونے لگا۔“ محمود غزنوی کی سلطنت اس کے بعد کم و بیش ایک صدی تک رہی۔ اس زمانے میں دارالسلطنت غزنی میں ایک ترجمان، ہندوستانی باہمی اظہار و خیال کے لئے رکھا جاتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک ہندی کے اس ہنگامہ خیز خلط ملط کا نتیجہ کچھ نہ نکلا ہوگا؟ اور اس کا اثر اس زمین پر نہ پڑا ہوگا؟ جہاں سب سے پہلے یہ دونوں قومیں آپس میں ٹکرائیں پھر سیاسی حالات اور تمدنی حالات بدل جانے سے ایک دوسرے کے قریب تر آ گئیں۔ مسعود سعد سلیمان اس دور کا شاعر تھا اس نے اپنا ہندی دیوان جس زبان میں لکھا ہوگا وہ سوائے پنجاب کی زبان کے اور کوئی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسعود نے خاص پنجابی طرز میں بھی اختیار کیں۔ چنانچہ اس کے فارسی کلام میں بھی ”بارہ ماسہ“ جو ایک خاص پنجابی چیز ہے اور جس کا رواج پنجابی شاعروں میں کچھ عرصہ تک یہاں عام پایا جاتا تھا اس ربط و نظم اور خلط ملط کا نتیجہ تھا کہ حکیم سنائی کے کلام میں بھی جو اسی عہد کے شاعر ہیں۔ بعض ہندوستانی الفاظ ”کو تو ال“، ”پانی“ وغیرہ ملتے ہیں کو تو ال کا لفظ کوٹ والا کی تبدیل شدہ صورت ہے جس کے معنی مالکِ قلعہ کے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس زمانے میں اس زمانے میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا ہوگا بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں فارسی، ترکی و پنجابی کے باہمی میل جول سے اس ملک کے باشندوں اور مسلمان آبادکاروں کے درمیان ذریعہ اظہار خیال کے لئے ایک

اشاعت بنایا گیا جوان بزرگان اور عوام کے درمیان ایک آسان رابطے کا کام دے سکتی تھی۔ تیسری وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ دکن کے تاجدار مغلیہ شہنشاہوں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان بھی پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو درواج دے کر اپنی تسکین طبع کا سامان مہیا کرتے ہوں۔ محمد تعلق کے آخر زمانہ سلطنت میں دکن نے بغاوت کی۔ حسن کنگو نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جو تقریباً دو سال تک حکمران رہا۔ اور پھر بہمنیوں کی سلطانی میراث پانچ مختلف خاندانوں میں بٹ گئی۔ یہ سلطنتیں طاقتور اور ممتاز تھیں۔ انہیں کے عہد میں اردو زبان کو ادبیات کا رتبہ ملا۔ یہ سارا عرصہ تقریباً ساڑھے تین سو سال کا ہے۔ اس زمانے میں دہلی اور دکن میں کوئی خاص پائیدار مستقل تمدنی، سیاسی تعلق قائم نہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بعض محاوروں سے مختلف ہو گئی۔ اہل علم نے اسی امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے ایک کا نام دکنی رکھا اور دوسری کا نام اردوئے معلیٰ رکھ دیا۔ دکنی زبان تعلقوں کے عہد کی زبان کی مقلد رہی۔ اور شمالی ہندوستان کی زبان بیرونی اثرات کے ماتحت بدلتی رہی۔ اور فارسی کی آغوش میں رہ کر اس کے بہت قریب ہو گئی۔ بہر حال دکنی شمالی ہندوستان کی اردو کتنی مختلف کیوں نہ ہو اس کی بنیادی صورت اردو سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ پنجابی کے ہیں۔ وہ جی جو دلی سے پہلے گزرا ہے جس کی کتاب ”مثنوی قطب مشتری“ نے دلی اورنگ آبادی سے اولیت کا سہرا چھین لیا۔ دکن کے قدیم اور اول درجے کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتاب کی زبان میں پنجابی الفاظ کثرت سے ملے ہوئے ہیں دلچسپی کے لئے چند ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے

لا دھار (سہارا) انب (آم) آپے (آپ) اجھوں (ابھی) کدھیں (کبھی) کوہ (کوس) مرنا (ڈوب مرنا) دسنا (نظر آنا) اس قبیل کے سینکڑوں الفاظ جو اس طرح جواز میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ جی کی شاعری کی مختلف اصناف کی بنیاد پڑی۔ اس مثنوی میں نظم کی یکسانیت کو توڑنے کی خاطر غزل کی صنف کو استعمال کیا گیا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ غزلیں بذات خود قدیم ادبیات اردو کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ جو بعد میں دلی کے یہاں جسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ بحث ناتمام رہے گی اگر ہم اردو کے مختلف علموں کا ذکر نہ کریں جو وقتاً فوقتاً اس کے لئے استعمال ہوتے رہے۔ یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ آج ہماری زبان جس لفظ کے ساتھ مشہور ہے۔ وہ ایک نیا نام ہے اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بازار یا کیپ وغیرہ کے ہیں۔ اور یہ لفظ فارسی تصنیفات میں اس زمانے سے چلا آتا ہے جب سے اس زبان پر منگولوں اور ترکوں نے اپنا اثر ڈالا سب سے پہلے جس کتاب میں یہ لفظ استعمال ہوا وہ ”جہاں کشائی جوینی“ ہے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے غالباً سب سے پہلے بابر نے اپنی کتاب ”تذکر“ میں اسے استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا۔ لیکن اس کے معنی لشکر گاہ اور چھاؤنی کے رہے۔ مغلوں کے زمانے میں چلتی ہوئی

افواج کے ساتھ جو نکسال قائم کی جاتی تھی۔ وہاں سے نکلے ہوئے سکوں پر ”اردوئے ظفر قرین“ لکھا جاتا تھا۔ محمد شاہ کے عہد کے قریب شاہی قلعہ کے باہر لاہوری دروازے کے پاس ایک بازار ”اردو بازار“ کے نام سے مشہور تھا۔ جو دکن کے بعد انگریزی فاتح افواج کے ہاتھوں تباہ ہو گیا جس کا ذکر غالب نے بھی اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اس طرح اس جگہ کے قریب ایک مندر ”اردو مندر“ کے نام سے آباد تھا جو غالباً لشکریوں کے ہندو عنصر کے لئے عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ غرضیکہ لفظ اردو کا استعمال ان چار پانچ مقامات پر نہیں یہ پتہ دیتا ہے کہ ہماری زبان بھی انہی لشکریوں سے مناسبت رکھنے کے باعث اس نام سے مشہور ہو گئی ہوگی اس خیال نے بعض لوگوں کو غلطی میں مبتلا کر دیا ہے کہ زبان اردو انہی لشکریوں کے اندر پیدا ہوئی اور اس کی عمر خواہ کتنی ہی ہو خود زبان کی موجودگی سے اس سے سینکڑوں سال پہلے سے ثابت شدہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں سب سے پہلے اردو کا لفظ استعمال کیا وہ محمد حسین خمیسین ہے۔ جنہوں نے اپنی کتاب ”نوطر زمرضح“ آج سے ایک صدی پہلے لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد تقریباً اسی زمانے میں میرامن نے ”باغ و بہار“ میں یہی نام استعمال کیا۔ اس کے بعد اس نام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج اس سے بہتر کوئی اور نام معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اردو کا موجودہ نام ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ خود خمیسین اور میرامن اردو نظم کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ریختہ کی کئی ایک تشریحات موجود ہیں مثلاً ریختہ وہ زبان ہے جو اپنی اصلیت سے گر جائے۔ آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ ریختہ کے معنی گری پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ چونکہ اردو میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہا گیا ہے۔ ایک اور جگہ (کشمیر میں) ریختہ (ریختہ) کے معنی چوڑے سفیدی وغیرہ کے ہیں۔ جو دیوار کو پختہ کرتا ہے اس لئے بھی شاید اس زبان کا نام ریختہ ہوا۔ لیکن سب سے معقول تعریف وہ ہے جو پروفیسر شیرانی نے کی ہے۔ ریختہ بمعنی ایجاد کرنا کسی چیز کو قالب میں ڈھالنا اور موزوں کرنا کے آتا ہے۔ آٹھویں صدی میں امیر خسرو نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے نئے نثر نکالے۔ جن میں سے ایک کا نام ریختہ رکھا۔ آہستہ آہستہ یہ لفظ موسیقی کے مفہوم سے نکل کر زبان اور پھر زبان کی اصطلاح عام بن گیا۔ خود امیر خسرو کے زمانہ ہی میں ریختہ اس نظم کو کہتے تھے جس میں فارسی اور ہندوستانی الفاظ کی آمیزش ہو اس مفہوم میں ریختہ کے لفظ کا استعمال کچھلی صدی تک ہوتا چلا آیا ہے۔..... یعنی وہ شاعرانہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی آمیزش سے ترتیب پا کر پھیل رہی تھی۔ بعد مواقع پر اس کا اطلاق نثر پر بھی ہوا ہے۔ ریختہ کے علاوہ اردو کا ایک نام دہلوی بھی ہے۔ بالکل اسی طرح اہل دکن اسے دکنی، اہل گجرات اسے گجراتی کہتے رہے۔ یہ نام دہلی سے نکلے ہوئے سپاہیوں کے ساتھ دور دور تک پہنچا۔ گجرات کے ایک صوفی شیخ باجن گجراتی نے ایک نظم لکھی ہے جس کا نام ”صفت دنیا بزرگان دہلوی“ ہے۔ جو اردو کا پرانا نمونہ ہے یورپ کے حملہ آور اور سیاح اسے (Language of Indians)



اور پھر ہندوستانی بھی کہتے رہے جو اٹھارہویں اور بالخصوص انیسویں صدی میں بہت عام رہا۔ (بشکریہ الفضل ڈیلی ۲۰ دسمبر ۲۰۱۳ء)

### تصویر پاکستان۔۔۔۔ عاصی صحرائی

ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی اپنی جیسی سے شکل بنا دی اس گلستان کی یہ سرزمین نہیں ہے صرف مسلمان کی یہ دھرتی تو جاگیر ہے ہر اچھے انسان کی ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اپنی اپنی انا کی خاطر کتنے گل کھلائے ہیں اسی لئے تو اب تک وطن پر کالے سائے ہیں سب قواعد اور قانونوں کو تم نے جھٹلایا ہے کبھی اطاعت نہ کی تو نے قائد کے فرمان کی ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اس گلشن پر اس کا حق ہے جس نے اسے بنایا ہے تم نے تو مظلوموں کا بے جا خون بہایا ہے نعرے لگا کر خوب لوگوں کو پاگل بنایا ہے سیاستدانوں نے آمروں کو ملک پکڑایا ہے بیورو کریٹ، تاجر، سیاستدان، وڈیروں نے

لوٹ لوٹ کر مار وطن کو کھایا ہے اس دھرتی پر اک ناکارہ بوجھ ہو تم یہ دھرتی تو جاگیر ہے ہر اچھے انسان کی ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اس وقت قوم کو تو نے فتوؤں میں الجھایا تھا مسلم لیگ کو کفر کا گڑھ، قائد کو کافر بنایا تھا وقت آزادی تو نے گاندی رسول بنایا تھا

پٹیل تمہارا بھائی، نہرو تمہارا تایا تھا ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر آزادی کو روکا تھا بادل نحواست آنے والو، کیا تم نے دھوکا تھا

پاکستان کا کونہ کونہ یہ سب ہمارا اپنا ہے اس کی حفاظت ہر شہری کا سپنا ہے تم تو بند گلی کے اندر بیٹھ کر شور مچاتے ہو

بڑے بہادر بنتے ہو، کمزوروں کو ستاتے ہو

ہمت ہے تو کھلی فضا میں، زہر یلے لب کھولو بنگال اور کشمیر کا آگے بڑھ کر بدلہ لو بزدل بن کر چاٹ رہے ہو گردن انگلستان کی

ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی تم تو بند گلی کے اندر بیٹھ کر شور مچاتے ہو ساٹھ سال خوب تو نے عیش اڑائی ہے مکاری سے خوب اپنی دکان چمکائی ہے گندے کرتوتوں سے کیا نام کمایا ہے

نہ کوئی دین ہے تیرا نہ باپ نہ بھائی ہے کردار تمہارا کوئی ہے یوں ہی حسینی بنتے ہو خونی کھیل جو کھیلا تو نے شمر یزیدی لگتے ہو دین کا چکر دے کر ساری قوم لڑائی ہے اپنے لالچ کی خاطر اطاعت کی شیطان کی

ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی جہاد کا نعرہ دے کر، فرنگی کا ڈالر کھاتے ہو غصب حقوق کر کے اپنا مال بناتے ہو مزدور و کسان، غرباء کی محنت دباتے ہو اپنے بزنس کا سارا ٹیکس چھپاتے ہو

قوم کا مال سب بیرون ملک چھپایا ہے۔ سرے محل، رائے ونڈ کیسے تو نے بنایا ہے امریکی ایجنڈا سے سعودی مال، ہضم کیا ملا کا فتویٰ لیکر جنگ کی افغان کی

ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی ویسے تو ہم پھول ہیں لیکن کانٹا بھی بن سکتے ہیں شیر جیسا دل ہے، شعلہ بھی بن سکتے ہیں یقین محکم، عمل پیہم، اطاعت و خدمت

ان پے چل کر مجاہد بھی بن سکتے ہیں اک رسول کے پیچھے چل کر منزل کو پانا ہے ہر قسم کا ظلم سہہ کر حسینی بھی بن سکتے ہیں

اختر ملک علی نے، جیسے محمد، چونڈہ جیتا تھا وقت پڑا تو پیش کریں گے وطن کو اپنی جان بھی

ظالم یہ کیسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی



کوئی مفہوم نہیں زیت کی تحریروں میں آج ہے وقت تمہارا نہیں رہنے کا یہ کل  
 خواب ڈھلتے نہیں اُن لوگوں کے تعبیروں میں دل کی آہوں کا بھروسہ نہیں جائے کب  
 ڈھونڈتے ہیں اندھیروں میں وہ اُمیدوں کی کرن بابِ رحمت پہ پہنچ جائیں تو کیا جائیے کب  
 خوف و دہشت سے مگر بڑھتی ہے دل کی دھڑکن آہِ مظلوم کا گردوں پہ گزر ہو جائے  
 اُگی آنکھیں ابھی پتھرائی نہیں ہے درِ افلاک پہ یہ آہ رسا ہو جائے  
 اُن کی منزل کا کوئی عکس نہیں ہے ممکن خون بہتا ہے جب انسان کی اس بستی میں  
 اُن کے پیاروں کے لئے گھر میں کوئی عید نہیں ظلم بڑھتا ہے تو اس کارِ گم ہستی میں  
 روشنی اُن کے گھروں میں نہیں اُمید نہیں صنفِ وقت کو تاریخ پلٹ دیتی ہے  
 چند خاموش نگاہیں جو بھکتی ہوگی تختِ شداد کو لمحوں میں اُلٹ دیتی ہے  
 یاس و حسرت سے دروبام کو سکتی ہوگی جن کے افکار بر انگیزت ہیں کینے میں مرے  
 ظلم کی دھوپ میں جلتے ہوئے شوریدہ بدن اور وہ ہاتھ جو پیوست ہے سینے میں مرے  
 طیشِ نمرود کو بھڑکاتی وہ تاریخِ گم گداز کیا خبر جو رستم سے ہی قلم ہو جائے  
 تمہر حکام کے معتوب اسیر زنداں گردنِ جبر کسی طرح سے خم ہو جائے  
 جن میں ہے صبر کے اظہار کی نحو، بے پایاں تب یہی خاکِ نشیں کارِ گم ہستی میں  
 اُن کو طاقت کا نشہ، جو رستم، جبر سہی ابنِ شیطان کی ستائی ہوئی اس بستی میں  
 ظلم ہتھیار اُدھر ہے تو ادھر صبر سہی وقت کی دھوپ میں ذروں کی طرح چمکے گے  
 وہ جلاتے ہیں چمن کو تو جلانے دو انہیں شبِ تاریک میں گردوں پہ کہیں دکھیں گے  
 وہ ہیں انجام سے غافل تو بتانے دو ہمیں رحمت اس ڈر کے اندھیرے کو گھٹائے جب تک  
 برگ جلتے ہیں تو اشجار بھی جل جاتے ہیں اور حق سفر کی ظلمت کو مٹائے جب تک  
 نیک جلتے ہیں تو بدکار بھی جل جاتے ہیں پست انسانوں کی گھٹتی ہوئی عظمت کو نہ دیکھ  
 جان لو وقت ہمیشہ نہیں رہتا یکساں ظلم کی دھوپ میں سایوں کی درازی کو نہ دیکھ  
 آہِ مظلوم میں بہت کچھ ہوتا ہے پنہاں ترقی پسند تحریک مصنفین سے وابستہ چند تخلیق کاروں کا ذکر عاصی صحرائی

**۱۔ مخدوم محی الدین:** (پیدائش ۴ فروری ۱۹۰۸ء اوقات اگست ۱۹۶۹ء)

مخدوم محی الدین: نے ۱۹۳۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ حیدرآباد دکن میں  
 انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ اسی شہر میں آسودہء خاک ہیں۔ مخدوم محی الدین  
 کی شاعری میں ترقی پسندانہ شعور کی انقلابی حرارت آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے  
 لاوے کی مانند ہے۔ جو ظالمانہ، غیر منصفانہ اور غاصبانہ استحصالی نظام کو بھسم کرنے کے  
 لئے ہمہ وقت دہک رہا ہے۔ جذبات کا ایک سیلی رواں ہے۔ جو شقاوت آمیز  
 ناانصافیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے پر قادر ہے۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو  
 وہ کہاں جا رہا ہے  
 کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے

حسرتیں بڑھ کے اندھیروں کو بڑھا دیتی ہیں  
 ظلمتیں بڑھ کے سویروں کو جگا دیتی ہیں  
 وحشت و ظلم کے انجام سے غافل ہو کر  
 ایک دن ظلم گرانبار سے بوجھل ہو کر  
 جب بھی ٹپکے گا سانِ کفِ قاتل سے لہو  
 کاٹ دے گا وہ ہر ایک ظلم کی شریانِ گلو  
 جب یہ انصاف کی چوکھٹ پہ دہائی دے گا  
 خونِ معصوم کا ہر قطرہ گواہی دے گا  
 تمہی قاتل تمہی شاہد تمہی منصف جب ہو  
 قتل انصاف کا چوکھٹ پہ تمہاری جب ہو  
 یاد رکھنا کہ بدلتا ہے زمانہ پل پل

بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے  
 لاش جلنے کی آ رہی ہے  
 جانے والے سپاہی سے پوچھو  
 کوہِ غم اور گراں اور گراں اور گراں  
 غم زدہ تیشے کو چکاؤ کہ کچھ رات کٹے  
 رات بھر دیدہء نم ناک میں لہراتے رہے  
 سان کی طرح آپ آتے رہے جاتے رہے

**۲۔ فیض احمد فیض:** (پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء وفات ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء)

فیض احمد فیض نے پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے لئے بہت سخت جدوجہد کے لئے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند اندازِ فکر ایک توازن اور اعتدال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں کہیں بھی انتہا پسندی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند سوچ اور غزل کی پُر سوز لے اس قدر پُر تاثیر لے میں ہم آہنگ ہو گئی ہے کہ قاری کو ایک مانوس فضا محسوس ہوتی ہے۔ اس کی تصانیف نقش فریادی (۱۹۳۳ء) دستِ صبا (۱۹۵۲ء) زندانِ نامہ (۱۹۵۶ء)، دستِ تہہ سنگ (۱۹۶۵ء) سروادیءِ سینا (۱۹۷۱ء)، شامِ شہرِ یاراں (۱۹۷۹ء)، مرے دل مرے مسافر (۱۹۸۱ء) نسخہ ہائے وفا (کلیات) ۱۹۸۴ء، قارئینِ ادب میں بہت مقبول ہوئیں۔ فیض احمد فیض کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے ۱۹۶۰ء میں نشانِ امتیاز عطا کیا گیا اس کے علاوہ انہیں نگار ایوارڈ اور لینن امن انعام سے بھی نوازا گیا۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں ترقی پسند اسلوب، سیاسی، سماجی، اور معاشرتی زندگی کے مسائل کو نہایت درد مندی اور خلوص کے ساتھ پیرایہ اظہار عطا کیا گیا ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو  
 کہ اپنی فرد سنبھالے  
 اٹھے گا جب جمع سر فردشاں  
 پڑیں گے دارورسن کے لالے  
 کوئی نہ ہوگا کہ بچالے  
 جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی  
 یہیں عذاب و ثواب ہوگا  
 یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر  
 یہیں یہ روزِ حساب ہو گا

**۳۔ اسرار الحق مجاز:** (پیدائش ۱۹۱۱ء وفات ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء)

اسرار الحق مجاز کا تعلق ایک ممتاز علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے جد امجد مضطر خیر آبادی اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ ردالی بارہ بنکی اُتر پردیش سے جنم لینے والے اس تخلیق

کار نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ان کی بہن کی شادی عظیم شاعر جاں نثار اختر سے ہوئی۔ اسرار الحق مجاز کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے انقلابی لہجے، سرمایہ دارانہ نظام سے شدید نفرت، فسطائی جبر اور استحصال کے خلاف مزاحمت اور انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں خُربتِ فکر کی لکار قابل توجہ ہے:

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی مٹھل جھڑی  
 جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی  
 ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی  
 اے غم دل کیا کروں، اے وحشِ دل کیا کروں  
 بڑھ کے اس اندر سبھا کا سازو سامان پھونک دوں  
 اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبتاں پھونک دوں  
 تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں  
 اے غم دل کیا کروں، اے وحشِ دل کیا کروں

**۴۔ احسان الحق احسان دانش:** (پیدائش ۱۹۱۴ء وفات ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء)

مزدور شاعر کی حیثیت سے احسان دانش:

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا  
 راستے بند ہیں سب کوچہء قاتل کے سوا  
 باعثِ رشک ہے تنہا روی رہو عشق  
 ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا  
 ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو  
 لیکن اس شوخ کے ہنگامہ محفل کے سوا  
 بچ منصف ہو جہاں، دارورسن ہو شاہد  
 بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا  
 جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار  
 کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا  
 احسان دانش کو بہت مقبولیت ملی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں

انہیں ۱۹۷۱ء میں حکومتِ پاکستان نے تمغہء امتیاز عطا کیا۔ احسان دانش خود بھی مزدور تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جو مزدوروں کے لئے لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے وہ ان کے ترقی پسندانہ شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی کی بھول بھلیوں م اور سراپوں میں حقائق کی جستجو اور راحت کی منزل کی تلاش ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ احسان دانش نے یہ کٹھن مرحلہ بڑے کرب سے گزرا۔ احسان دانش کی شاعری میں سماجی زندگی کے مسائل کا حقیقی احساس و ادراک قابل توجہ ہے۔ ایک ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بے بس ولا چار غریب مریض جس جان لیوا کرب سے گزرتے ہیں ان کا احوال حد درجہ

لرزہ خیز اور اعصاب شکن ہے۔

۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ معین احسن جذبی کی شاعری کی انفرادیت اور مرگ طلب قنوطیت قاری کو اداس کر جاتی ہے۔ اس کے اسلوب میں زندگی کے بارے میں جو سوچ پائی جاتی ہے اس میں جوش کی کمی ہے اور وہ متضاد نوعیت کی ہے:

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی  
اب ایسی شکستہ کشتی میں ساحل کی تمنا کون کرے  
ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں  
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں  
اے موج تلاطم ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے  
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارا کرتے ہیں

**۸۔ شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی۔** پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۵ء، وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء) جوش ملیح آبادی کی شاعری میں پائی جانے والی انانیت اور انفرادیت کا کرشمہ دامن دل کھینچتا ہے۔ وہ ترقی پسندانہ سوچ کو انقلاب کی سمت لے جاتے ہیں۔ ان کے دنگ لہجے کی بنا پر انہیں شاعر انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ۲۰۱۳ء میں ہلال امتیاز عطا کیا گیا۔ جوش کی تصانیف کی تعداد ۲۸ عدد ہے۔ ان میں شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، فکر و نشاط، سنبل و سلاسل، حرف و حکایت، اور سرد و خروش کو بہت پذیرائی ملی۔ جوش کی خودنوشت ”یادوں کی برات“ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت اپنے اسلوب، موضوع اور مواد کے لحاظ سے ایک منفرد تجربہ ہے۔ جوش کی شاعری میں حق گوئی اور بے باکی اپنی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے۔

لایا ہوں بزم و رزم کی ارض تضاد سے  
قدم انساں کا راہ دہر میں پتھرا ہی جاتا ہے  
ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر  
مگر جو گھر کے آتا ہے بادل چھا ہی جاتا ہے  
یہ طبل جنگ و ساز شبستان ترے لئے  
چلے کتنا ہی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

**۹۔ عبدالحی ساحر لدھیانوی۔** (پیدائش ۸ مارچ ۱۹۲۱ء، وفات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء) ساحر لدھیانوی نے اپنی شاعری میں معاشرے کے مفلوک الحال، پس ماندہ اور استحصال کے پاٹوں میں پسے والی، بے بس و لاچار انسانیت کے مصائب کو موضوع بنایا ہے۔

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں  
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ تمہارے ہیں  
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہونگے

دوائیں باسی، خراب پوشش، نہ تازہ کھانا، نہ صاف پانی  
نہ خون میں زندگی کی گرمی، نہ سانس میں جان فزا روانی  
نہ کوئی آثار تن درستی نہ کوئی خدمت گزار اُن کا  
وہ نوجوان خود پسند لڑکے، ابھی جو تعلیم پارہے تھے  
غریب فاقہ کشوں کی جانوں کو تجربوں میں گنوارہے تھے

## ۵۔ علی سردار جعفری:

(پیدائش ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء، وفات یکم اگست ۲۰۰۰ء)

علی سردار جعفری نے ۱۹۳۳ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن ۱۹۳۶ء میں ان کے ترقی پسند خیالات کے باعث یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی کالج سے گریجوایشن کی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے پوسٹ گریجوایشن کی۔ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جنگ کے خلاف نظمیں لکھنے پر انہیں حکومت نے زندان میں ڈال دیا۔ ترقی پسند تحریک کے ادبی مجلے ”نیا ادب“ کی ادارت کی ذمہ داریاں انہوں نے (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۹) بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی اور سماج کے متعدد اہم مسائل کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ شعور پوری شدت کے ساتھ موجود ہے

## ۶۔ جاں نثار اختر:

(پیدائش ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء، وفات ۱۹ اگست ۱۹۷۶ء)

جاں نثار اختر ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اُن کے والد مضطر خیر آبادی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ بی اے آنرز کے بعد ایم اے کی ڈگری لی ان کی شاعری میں درد و غم کی کیفیت قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں  
کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لئے ہیں  
ان ڈھواں دھار اندھیروں سے گزرنے کے لئے  
خونِ دل سے کوئی مشعل توجلانی ہوگی  
عشق کے رفتہ و سرگشتہ جنوں کو اے دوست  
زندگی کی ادا آج سکھانی ہوگی

## ۷۔ معین احسن جذبی:

(پیدائش ۲۱ اگست ۱۹۱۲ء، وفات ۱۳ فروری ۲۰۰۵ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ”مولانا حالی حیات اور ادبی خدمات“ کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اسی جامعہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے شعری مجموعے ”فروزاں“، ”سخن مختصر“ اور ”گدازِ شب“ ترقی پسند شعور کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری کے کلیات ساہتیہ اکیڈمی دہلی کے زیر اہتمام

